© rasailojaraid.com

خلافت اور ملوکیت کا فرق

ابوالاعلیٰ مودودی

اس سے پہلے اِن صفحات میں ہم تفصیل کے ساتھ یہ بیان کر چکے ہیں کہ خلافت کس طرح کن مراحل سے گزرتی ہوئی آخر کار ملوکیت میں تبدیل ہوئی۔ اِس رُوداد کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کا خلافتِ راشدہ جیسے بے نظیر مثالی نظام کی نعمت سے محروم ہو جانا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا جو اچانک بلا سبب رونما ہو گیا ہو، بلکہ اس کے کچھ اسباب تھے اور وہ تدریج امت کو دھکیلتے ہوئے خلافت سے ملوکیت کی طرف لے گئے۔ اِس المناک تغیّر کے دوران میں جتنے مراحل پیش آئے، ان میں سے ہر مرحلے پر اِن کو روکنے کے امکانات موجود تھے، مگر امّت کی، اور درحقیقت پوری نوعِ انسانی کی یہ بد قسمتی تھی کہ تغیّر کے اسباب بہت زیادہ طاقت ور ثابت ہوئے، حتیٰ کہ ان امکانات میں سے کسی ایک کا فائدہ بھی نہ اٹھایا جا سکا۔

اب ہمیں اِس سوال پر بحث کرنی ہے کہ خلافت اور ملوکیت کے درمیان اصل فرق کیا تھا ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کے آجانے سے حقیقت میں کیا تغیّر واقع ہوا، اور اس کے کیا اثرات مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر مترتب ہوئے۔

تقررِ خلیفہ کے دستور میں تبدیلی | اوّلین بنیادی تبدیلی اُس دستوری قاعدے میں ہوئی جس کے مطابق کسی شخص کو امّت کا سربراہ بنایا جاتا تھا۔

خلافتِ راشدہ میں وہ قاعدہ یہ تھا کہ کوئی شخص خود خلافت حاصل کرنے کے لیے نہ اُٹھے اور اپنی سعی و تدبیر سے برسرِ اقتدار نہ آئے، بلکہ لوگ جس کو امّت کی سربراہی کے لیے موزوں سمجھیں، اپنے مشورے سے اقتدار اُس کے سپرد کر دیں۔ بیعت اقتدار کا نتیجہ نہیں بلکہ اُس کا سبب ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیعت حاصل ہونے میں آدمی کی اپنی کسی کوشش یا سازش کا قطعاً کوئی دخل نہ ہو۔ لوگ بیعت کرنے یا نہ کرنے کے معاملہ میں پوری طرح آزاد ہوں اور جب تک کسی کو لوگوں کی آزادانہ رضامندی سے بیعت حاصل نہ ہو جائے وہ برسرِ اقتدار نہ آئے۔

خلفائے راشدین میں سے ہر ایک اسی قاعدے کے مطابق برسرِ اقتدار آیا تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی خود خلافت لینے کی برائے نام بھی کوئی کوشش نہ کی تھی، بلکہ جب خلافت ان کو دی گئی تب انہوں نے اس کو لیا۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اگر کوئی شخص زیادہ سے زیادہ کچھ کہہ سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کے لیے احق سمجھتے تھے لیکن کسی قابلِ اعتبار تاریخی روایت سے ان کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کے لیے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو۔ لہٰذا ان کا محض اپنے آپ کو احق سمجھنا اس قاعدے کے خلاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ درحقیقت چاروں خلفا اس معاملہ میں بالکل یکساں تھے کہ ان کی خلافت دی ہوئی خلافت تھی نہ کہ لی ہوئی خلافت۔

ملوکیت کا آغاز اسی قاعدے کی تبدیلی سے ہوا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت اس نوعیت کی خلافت نہ تھی کہ مسلمانوں کے بنانے سے وہ خلیفہ بنے ہوں اور اگر مسلمان ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے تو وہ نہ بنتے۔ وہ بہرحال خلیفہ ہونا چاہتے تھے، انہوں نے لڑ کر خلافت حاصل کی، مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہ تھا۔ لوگوں نے ان کو خلیفہ نہیں بنایا، وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو لوگوں کے لیے بیعت کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ اُس وقت اگر ان سے بیعت نہ کی جاتی تو اس کا نتیجہ یہ نہ ہوتا کہ وہ اپنے حاصل کردہ منصب سے ہٹ جاتے، بلکہ اس کے معنی خونریزی و بدنظمی کے تھے جسے امن اور نظم پر ترجیح نہیں دی جا سکتی تھی۔ اسی لیے امام حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری (ربیع الاول ۴۱ھ) کے بعد تمام صحابہ و تابعین اور صلحائے امت نے ان کی بیعت پر اتفاق کیا۔

حضرت معاویہ خود بھی اِس پوزیشن کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اپنے زمانۂ خلافت کے آغاز میں انہوں نے مدینہ طیبہ میں تقریر کرتے ہوئے خود فرمایا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اما بعد فانی واللہ ما ولیت امرکم حین ولیتہ وانا اعلم انکم لا تسرون بولایتی ولا تحبونہا وانی لعالم بما فی نفوسکم من ذالک ولکنی خالستکم بسیفی ہذا مخالسۃ ۔ ۔ ۔ ۔ وان لم تجدونی اقوم بحقکم کلہ فارضوا منی ببعضہ[۱]۔

"بخدا میں تمہاری حکومت کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ تم میرے برسرِ اقتدار آنے سے خوش نہیں ہو اور اسے پسند نہیں کرتے۔ اس معاملہ میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے میں خوب جانتا ہوں، مگر میں نے اپنی اس تلوار کے زور سے تم کو مغلوب کر کے سے ۔ ۔ ۔ ۔ اب اگر تم یہ دیکھو کہ میں تمہارا حق پورا پورا ادا نہیں کر رہا ہوں تو تھوڑے پر مجھ سے راضی رہو۔"

اس طرح جس تغیر کی ابتدا ہوئی تھی، یزید کی ولی عہدی کے بعد سے وہ ایسا مستحکم ہوا کہ موجودہ صدی میں مصطفیٰ کمال کے الغائے خلافت تک ایک دن کے لیے بھی اس میں تزلزل واقع نہ ہوا۔ اس سے جبری بیعت اور خاندانوں کی موروثی بادشاہت کا ایک مستقل طریقہ چل پڑا۔ اس کے بعد سے آج تک مسلمانوں کو انتخابی خلافت کی طرف پلٹنے کا کوئی موقع نصیب نہ ہو سکا۔ لوگ مسلمانوں کے آزادانہ اور کھلے مشورے سے نہیں بلکہ طاقت سے برسرِ اقتدار آتے رہے۔ بیعت سے اقتدار حاصل ہونے کے بجائے اقتدار سے بیعت حاصل ہونے لگی۔ بیعت کرنے یا نہ کرنے میں مسلمان آزاد نہ رہے۔ بیعت کا حاصل ہونا اقتدار پر قابض ہونے اور قابض رہنے کے لیے شرط نہ رہا۔ لوگوں کی اوّل تو یہ مجال نہ تھی کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آیا ہوا تھا اس کے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے لیکن اگر وہ بیعت نہ بھی کرتے تو اس کا نتیجہ ہرگز یہ نہ ہوتا تھا کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا ہو وہ ان کے بیعت نہ کرنے کی وجہ سے ہٹ جائے۔

یہاں یہ بحث بالکل غیر متعلق ہے کہ مسلمانوں کی آزادانہ مشاورت کے بغیر جو خلافت یا

---

[۱] البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج۸، ۱۳۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امارت بزور قائم ہو گئی ہو وہ آئینی طور پر منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں۔ اصل سوال منعقد ہونے یا نہ ہونے کا نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اسلام میں نصبِ خلافت کا صحیح طریقہ آیا وہ ہے جس سے خلفائے راشدین خلیفہ ہوئے، یا وہ جس سے حضرت معاویہ اور ان کے بعد کے لوگ خلیفہ بنے؟ ایک طریقہ کسی کام کے کرنے کا وہ ہے جس کی اسلام نے ہم کو ہدایت دی ہے۔ دوسرا طریقہ اسی کام کے کرنے کا وہ ہے جس کے مطابق اگر وہ کام کر ڈالا جائے تو اسلام اسے برداشت کر لینے کی ہمیں صرف اس لیے تلقین کرتا ہے کہ اسے مٹانے اور بدلنے کی کوشش کہیں اُس سے بھی زیادہ بدتر حالات پیدا نہ کر دے۔ بڑا ظلم کرے گا وہ شخص جو ان دونوں کو ایک درجے میں رکھ دے اور دعویٰ کرے کہ اسلام میں یہ دونوں طریقے یکساں جائز ہیں۔ ایک محض جائز نہیں بلکہ عین مطلوب ہے۔ دوسرا اگر جائز ہے تو قابلِ برداشت ہونے کی حیثیت سے ہے نہ کہ پسندیدہ اور مطلوب ہونے کی حیثیت سے۔

خلفاء کے طرزِ زندگی میں تبدیلی | دوسری نمایاں تبدیلی یہ تھی کہ دورِ ملوکیت کے آغاز ہی سے بادشاہ قسم کے خلفاء نے قیصر و کسریٰ کا سا طرزِ زندگی اختیار کر لیا اور اُس طریقے کو چھوڑ دیا جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفائے راشدین زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے شاہی محلات میں رہنا شروع کر دیا۔ شاہی حرس (BODYGUARD) اُن کے محلوں کی حفاظت کرنے اور اُن کے جلو میں چلنے لگے۔ حاجب و دربان اُن کے اور عوام کے درمیان حائل ہو گئے۔ رعیّت کا براہِ راست اُن تک پہنچنا اور اُن کا خود رعیّت کے درمیان رہنا سہنا اور چلنا پھرنا بند ہو گیا۔ اپنی رعیّت کے حالات معلوم کرنے کے لیے وہ اپنے ماتحت کارپردازوں کے محتاج ہو گئے جن کے ذریعہ سے کبھی کسی حکومت کو بھی صحیح صورتِ احوال کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ اور رعیّت کے لیے بھی یہ ممکن نہ رہا کہ بلا توسط اُن تک اپنی حاجات اور شکایات لے کر جا سکیں۔ یہ طرزِ حکومت اُس طرز کے بالکل برعکس تھا جس پر خلفائے راشدین حکومت کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ عوام کے درمیان رہے جہاں ہر شخص ان سے آزادی کے ساتھ مل سکتا تھا۔ وہ بازاروں میں چلتے پھرتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے اور ہر شخص ان کا دامن پکڑ سکتا تھا۔ وہ پانچوں وقت عوام کے ساتھ انہی کی صفوں میں نمازیں پڑھتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں ذکر اللہ اور تعلیم دین کے ساتھ ساتھ اپنی حکومت کی پالیسی سے بھی عوام کو آگاہ کرتے تھے اور اپنی ذات اور اپنی حکومت کے خلاف عوام کے ہر اعتراض کا جواب وہیں دیتے تھے۔ اس طریقے کو حضرت علی نے کوفے میں اپنی جان کا خطرہ مول لے کر بھی آخر وقت تک نباہا لیکن ملوکیت کا دور شروع ہوتے ہی اس نمونے کو چھوڑ کر روم و ایران کے بادشاہوں کا نمونہ اختیار کر لیا گیا۔ اس تبدیلی کی ابتدا حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ بعد میں یہ برابر بڑھتی ہی چلی گئی۔

بیت المال کی حیثیت میں تبدیلی | تیسری اہم تبدیلی بیت المال کے متعلق خلفاء کے طرزِ عمل میں رونما ہوئی۔

بیت المال کا اسلامی تصور یہ تھا کہ وہ خلیفہ اور اس کی حکومت کے پاس خدا اور خلق کی امانت ہے جس میں کسی کو من مانے طریقے پر تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ خلیفہ نہ اس کے اندر قانون کے خلاف کوئی چیز داخل کر سکتا ہے، نہ قانون کے خلاف اس میں سے کچھ خرچ کر سکتا ہے۔ وہ ایک ایک پائی کی آمد اور خرچ کے لیے جواب دہ ہے۔ اور اپنی ذات کے لیے وہ صرف اتنی تنخواہ لینے کا حق دار ہے جتنی ایک اوسط درجے کی زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہو۔

دورِ ملوکیت میں بیت المال کا یہ تصور اس تصور سے بدل گیا کہ خزانہ بادشاہ اور شاہی خاندان کی ملک ہے، رعیت بادشاہ کی محض باجگزار ہے، اور کسی کو حکومت سے حساب پوچھنے کا حق نہیں ہے۔ اس دور میں بادشاہوں اور شاہزادوں کی، بلکہ ان کے گورنروں اور سپہ سالاروں تک کی زندگی جس شان سے بسر ہوتی تھی وہ بیت المال میں بیجا تصرف کے بغیر کسی طرح ممکن نہ تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ میں جب شاہزادوں اور امراء کی ناجائز املاک کا محاسبہ کیا، اس وقت انہوں نے خود اپنی، ۴۰ ہزار دینار سالانہ کی جائداد، جو انہیں اپنے والد عبدالعزیز بن مروان سے میراث میں ملی تھی، بیت المال کو واپس کی۔ اس جائداد میں فدک بھی شامل تھا جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام خلفاء کے زمانہ میں بیت المال کی ملک رہا تھا اور حضرت ابوبکرؓ نے اسے حضورؐ کی میراث میں آپ کی صاحبزادی تک کو دینے سے انکار کر دیا تھا، مگر مروان بن الحکم نے اپنے زمانۂ خلافت میں اسے اپنی ملک اور اپنی اولاد کی میراث بنا لیا۔[۲۸]

یہ تو تھا بیت المال سے خرچ کے معاملہ میں ان حکمرانوں کا طرز عمل۔ اب بیت المال کی آمدنی کو دیکھیے تو نظر آتا ہے کہ اس کے بارے میں بھی حلال و حرام کی تمیز ان کے ہاں اٹھتی چلی گئی۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے اپنے ایک فرمان میں اُن ناجائز ٹیکسوں کی ایک فہرست دی ہے جو اُن کے پیش رو شاہان بنی امیہ کے زمانے میں رعایا سے وصول کیے جاتے تھے۔[۲۹] اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے بیت المال کی آمدنی کے بارے میں شریعت کے قواعد کو کس بُری طرح توڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ جو غیر مسلم اسلام قبول کر لیتے تھے ان پر بھی اس بہانے جزیہ لگا دیا جاتا تھا کہ یہ محض جزیے سے بچنے کے لیے ایمان لا رہے ہیں، حالانکہ اصل وجہ اس فعل کی یہ تھی کہ اشاعتِ اسلام سے اُن کو بیت المال کی آمدنی کم ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ابن اثیر کی روایت ہے کہ حجاج بن یوسف (عراق کے وائسرائے) کو اُس کے عاملوں نے لکھا کہ ذمی کثرت سے مسلمان ہو ہو کر بصرہ و کوفہ میں آباد ہو رہے ہیں اور اس سے جزیہ و خراج کی آمدنی گھٹ رہی ہے۔ اس پر حجاج نے فرمان جاری کیا کہ ان لوگوں کو شہروں سے نکالا جائے اور ان پر حسبِ سابق جزیہ لگایا جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں جب یہ نومسلم بصرہ و کوفہ سے نکالے جا رہے تھے تو وہ یا محمداہ، یا محمداہ پکار پکار کر روتے جاتے تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں جا کر اس ظلم پر فریاد کریں۔ اس صورتِ حال پر بصرہ و کوفہ کے علماء و فقہاء چیخ اٹھے اور جب یہ نومسلم روتے پیٹتے شہروں سے نکلے تو علماء و فقہاء بھی ان کے ساتھ روتے جاتے تھے۔[۳۰] حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ ہوئے تو خراسان سے ایک وفد نے آکر اُن سے

۲۸۔ ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۶۴۔ البدایہ، ج ۹، ص ۲۰۰ - ۲۰۸

۲۹۔ الطبری، ج ۵، ص ۳۲۱۔ ابن الاثیر ج ۴، ص ۱۶۳ ۳۰۔ ابن الاثیر ج ۴، ص ۷۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شکایت کی کہ ہزارہا آدمی جو مسلمان ہوئے تھے، سب پر جزیہ لگا دیا گیا ہے، اور گورنر کے تعصب کا یہ حال ہے کہ وہ علانیہ کہتا ہے "اپنی قوم کا ایک آدمی مجھے دوسرے سو آدمیوں سے زیادہ عزیز ہے"۔ اسی بنیاد پر حضرتِ موصوف نے الجراح بن عبداللہ الحکمی کو خراسان کی گورنری سے معزول کیا اور اپنے فرمان میں لکھا کہ "اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو داعی بنا کر بھیجا تھا نہ کہ تحصیلدار"۵۰

آزادیٔ اظہار رائے کا خاتمہ | اس دور کے تغیرات میں سے ایک اور اہم تغیر یہ تھا کہ مسلمانوں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آزادی سلب کر لی گئی، حالانکہ اسلام نے اسے مسلمانوں کا حق ہی نہیں بلکہ فرض قرار دیا تھا، اور اسلامی معاشرہ و ریاست کا صحیح راستے پر چلنا اس پر منحصر تھا کہ قوم کا ضمیر زندہ اور اس کے افراد کی زبانیں آزاد ہوں، ہر غلط کام پر وہ بڑے سے بڑے آدمی کو ٹوک سکیں اور حق بات برملا کہہ سکیں۔ خلافتِ راشدہ میں لوگوں کی یہ آزادی پوری طرح محفوظ تھی۔ خلفائے راشدین اس کی نہ صرف اجازت دیتے تھے بلکہ اس پر لوگوں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اُن کے زمانہ میں حق بات کہنے والے ڈانٹ اور دھمکی سے نہیں، تعریف و تحسین سے نوازے جاتے تھے، اور تنقید کرنے والوں کو دبایا نہیں جاتا تھا بلکہ ان کو معقول جواب دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لیکن دورِ ملوکیت میں ضمیروں پر قفل چڑھا دیے گئے اور زبانیں بند کر دی گئیں۔ اب قاعدہ یہ ہو گیا کہ منہ کھولو تو تعریف کے لیے کھولو، ورنہ چپ رہو۔ اور اگر تمہارا ضمیر ایسا ہی زوردار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو قید اور قتل اور کوڑوں کی مار کے لیے تیار ہو جاؤ۔ چنانچہ جو لوگ بھی اس دور میں حق بولنے اور غلط کاریوں پر ٹوکنے سے باز نہ آتے ان کو بدترین سزائیں دی گئیں تاکہ پوری قوم دہشت زدہ ہو جائے۔

اس نئی پالیسی کی ابتدا حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں حضرت حُجر بن عدی کے قتل (۵۱ھ) سے ہوئی جو ایک زاہد و عابد صحابی اور صلحائے امت میں ایک اونچے مرتبے کے شخص تھے۔ حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں جب منبروں پر خطبوں میں علانیہ حضرت علیؓ پر لعنت اور سب و شتم کا سلسلہ

۵۰ الطبری، ج ۵، ص ۳۱۴۔ ابن الاثیر، جلد ۴، ص ۱۵۸۔ البدایہ، ج ۹، ص ۱۸۸۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شروع ہوا تو عام مسلمانوں کے دل ہر جگہ ہی اس سے زخمی ہو رہے تھے مگر لوگ خون کا گھونٹ پی کر خاموش ہو جاتے تھے۔ کوفہ میں حُجر بن عدی سے صبر نہ ہو سکا اور انہوں نے جواب میں حضرت علیؓ کی تعریف اور حضرت معاویہؓ کی مذمت شروع کر دی۔ حضرت مُغیرہ جب تک کوفہ کے گورنر رہے، وہ ان کے ساتھ رعایت برتتے رہے۔ ان کے بعد جب زیاد کی گورنری میں بصرہ کے ساتھ کوفہ بھی شامل ہو گیا تو اُس کے اور اِن کے درمیان کشمکش برپا ہو گئی۔ وہ خطبے میں حضرت علیؓ کو گالیاں دیتا تھا اور یہ اٹھ کر اس کا جواب دینے لگتے تھے۔ اسی دوران میں ایک مرتبہ انہوں نے نماز جمعہ میں تاخیر پر بھی اُس کو ٹوکا۔ آخر کار اس نے انہیں اور ان کے بارہ ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور ان کے خلاف بہت سے لوگوں کی شہادتیں اِس فردِ جُرم پر لیں کہ "انہوں نے ایک جتھا بنا لیا ہے خلیفہ کو علانیہ گالیاں دیتے ہیں، امیر المومنین کے خلاف لڑنے کی دعوت دیتے ہیں، ان کا دعویٰ یہ ہے کہ خلافت آلِ ابی طالب کے سوا کسی کے لیے درست نہیں ہے، انہوں نے شہر میں فساد برپا کیا اور امیر المومنین کے عامل کو نکال باہر کیا، یہ ابوتراب (حضرت علیؓ) کی حمایت کرتے ہیں، اُن پر رحمت بھیجتے ہیں اور اُن کے مخالفین سے اظہارِ براءت کرتے ہیں۔" ان گواہیوں میں سے ایک گواہی قاضی شُریح کی بھی ثبت کی گئی، مگر انہوں نے ایک الگ خط میں حضرت معاویہ کو لکھ بھیجا کہ "میں نے سنا ہے آپ کے پاس حُجر بن عدی کے خلاف جو شہادتیں بھیجی گئی ہیں ان میں ایک میری شہادت بھی ہے۔ میری اصل شہادت حجر کے متعلق یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، دائماً حج و عمرہ کرتے رہتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے اور بدی سے روکتے ہیں۔ ان کا خون اور مال حرام ہے۔ آپ چاہیں تو انہیں قتل کریں ورنہ معاف کر دیں۔"

اِس طرح یہ ملزم حضرت معاویہ کے پاس بھیجے گئے اور انہوں نے ان کے قتل کا حکم دے دیا۔ قتل سے پہلے جلادوں نے ان کے سامنے جو بات پیش کی وہ یہ تھی کہ "ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم علی سے براءت کا اظہار کرو اور ان پر لعنت بھیجو تو تمہیں چھوڑ دیا جائے ورنہ قتل کر دیا جائے۔" ان لوگوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور حُجر نے کہا "میں زبان سے وہ بات نہیں نکال سکتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو رب کو ناراض کرے۔" آخر کار وہ اور ان کے سات ساتھی قتل کر دیئے گئے۔ ان میں سے ایک صاحب عبدالرحمٰن بن حسّان کو حضرت معاویہ نے زیاد کے پاس واپس بھیج دیا اور اس کو لکھا کہ انہیں بدترین طریقہ سے قتل کرو۔ چنانچہ اس نے انہیں زندہ دفن کرا دیا۔[6]

اس واقعہ نے امت کے تمام صلحاء کا دل دہلا دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عائشہ کو یہ خبر سن کر سخت رنج ہوا۔ حضرت عائشہؓ نے حضرت معاویہ کو اس فعل سے باز رکھنے کے لیے پہلے ہی خط لکھا تھا۔ بعد میں جب ایک مرتبہ حضرت معاویہ ان سے ملنے آئے تو انہوں نے فرمایا "اے معاویہ، تمہیں حُجر کو قتل کرتے ہوئے خدا کا ذرا خوف نہ ہوا" حضرت معاویہ کے گورنر خراسان ربیع بن زیاد الحارثی نے جب یہ خبر سنی تو پکار اُٹھے کہ "خدایا اگر تیرے علم میں میرے اندر کچھ خیر باقی ہے تو مجھے دنیا سے اٹھا لے۔"[7] حضرت حسن بصری فرماتے ہیں: "حضرت معاویہ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب بھی کرے تو وہ اس کے حق میں مہلک ہو۔ ایک، ان کا اس امت پر تلوار سونت لینا اور مشورے کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا، درآنحالیکہ امت میں بقایائے صحابہ موجود تھے۔ دوسرے، ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا حالانکہ وہ شرابی اور نشہ باز تھا، ریشم پہنتا اور طنبورے بجاتا تھا۔ تیسرے ان کا زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف حکم موجود تھا کہ اولاد اُس کی ہے جس کے بستر پر وہ پیدا ہو، اور زانی کے لیے کنکر پتھر ہیں۔[8] چوتھے ان کا حُجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کر دینا۔[9]

اس کے بعد لوگوں کی آواز کو جبر و ظلم سے دبانے کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ مروان بن الحکم

---

[6] اس قصے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو الطبری، ج ۴، ص ۱۹۰ تا ۲۰۷۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب، ج ۱، ص ۱۳۵۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۳۴ تا ۲۴۲۔ البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۵۰۔۵۵

[7] الاستیعاب، ج ۱، ص ۱۳۵، الطبری، ج ۴، ص ۲۰۸

[8] اس معاملہ کی تفصیل آگے آتی ہے۔

[9] ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۴۲۔ البدایہ، ج ۸، ص ۱۳۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اپنی گورنری مدینہ کے زمانہ میں حضرت مسوَر بن مخرمہ کو اس قصور میں لات ماردی کہ انہوں نے اس کی ایک بات پر یہ کہہ دیا تھا کہ "آپ نے یہ بُری بات کہی ہے"[۹]۔ حجاج بن یوسف کو ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے خطبہ لمبا کرنے اور نمازِ جمعہ میں حد سے زیادہ تاخیر کرنے پر ٹوکا تو اس نے کہا "میرا ارادہ ہے کہ تمہاری یہ دونوں آنکھیں جس سر میں ہیں اس پر ضرب لگادوں"[۱۰]۔ عبدالملک بن مروان ۷۵ھ میں جب مدینہ گیا تو منبرِ رسولؐ پر کھڑے ہو کر اس نے اعلان کیا کہ :

"میں اس اُمّت کے امراض کا علاج تلوار کے سوا کسی اور چیز سے نہ کرونگا ۔۔۔۔ اب اگر کسی نے مجھے اِتَّقِ اللہ کہا تو میں اس کی گردن ماردوں گا"[۱۱]۔

ولید بن عبدالملک نے ایک دفعہ خطبۂ جمعہ کو اتنا طول دیا کہ عصر کا وقت بھی گزرنے لگا۔ ایک شخص نے اُٹھ کر کہا "امیر المومنین، وقت آپ کا انتظار نہ کرے گا، اور نماز میں اتنی تاخیر کر دینے پر آپ خدا کے سامنے کوئی عذر پیش نہ کر سکیں گے"۔ ولید نے جواب دیا "اے شخص تو نے سچ کہا، مگر ایسے راست گفتار آدمی کی جگہ وہ نہیں ہے جہاں تو کھڑا ہے"۔ چنانچہ اسی وقت شاہی باڈی گارڈ نے اسے قتل کر کے جنت پہنچانے کا انتظام کر دیا[۱۲]۔

یہ پالیسی رفتہ رفتہ مسلمانوں کو پست ہمت اور مصلحت پرست بناتی چلی گئی۔ خطرہ مول لے کر سچی بات کہنے والے ان کے اندر کم ہوتے چلے گئے۔ خوشامد اور ضمیر فروشی کی قیمت مارکیٹ میں چڑھتی اور حق پرستی و راست بازی کی قیمت گرتی چلی گئی۔ اعلیٰ قابلیت رکھنے والے، ایماندار اور باضمیر لوگ حکومت سے بے تعلق ہو گئے، اور عوام کا حال یہ ہو گیا کہ انہیں ملک اور اس کے

---

[۱۰] الاستیعاب، ج ۱، ص ۳۵۳

[۱۱] الاستیعاب، ج ۔ ص ۳۶۹۔ اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ ابن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے۔ ج ۴، ص ۱۸۴

[۱۲] ابن الاثیر، ج ۴، ص ۱۰۴-۱۰۴۔ احکام القرآن للجصاص ج ۱، ص ۸۲۔ فوات الوفیات، محمد بن شاکر الکتبی، ج ۲، ص ۳۳، مطبعۃ السعادۃ، مصر۔

[۱۳] ابن عبد ربہ، العقد الفرید، ج ۱، ص ۶۲، لجنۃ التالیف والترجمہ، قاہرہ، ۱۹۴۰ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معاملات سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ حکومتیں آتی اور جاتی رہیں، مگر لوگ بس ان کی آمد و رفت کے تماشائی بن کر رہ گئے۔ عام لوگوں میں اس پالیسی نے جس سیرت و کردار کو نشو و نما دینا شروع کیا اس کا ایک نمونہ وہ واقعہ ہے جو حضرت علی بن حسین (امام زین العابدین) کے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ بیان فرماتے ہیں کہ سانحہ کربلا کے بعد ایک شخص چھپا کر مجھے اپنے گھر لے گیا اور میری خوب خاطر مدارات کی۔ اس کا حال یہ تھا کہ ہر وقت مجھے دیکھ دیکھ کر روتا تھا اور میں اپنی جگہ یہ سمجھتا تھا کہ میرے لیے اگر کسی شخص کے اندر وفا ہے تو وہ یہ شخص ہے۔ اتنے میں عبیداللہ بن زیاد کی یہ منادی سنی گئی کہ جو کوئی علی بن حسین کو ہمارے پاس پکڑ لائے گا اسے تین سو درہم انعام دیا جائے گا یہ اعلان سنتے ہی وہ شخص میرے پاس آیا، میرے ہاتھ میری گردن سے باندھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ اسی حالت میں وہ مجھے ابن زیاد کے پاس لے گیا اور اس سے انعام حاصل کر لیا (طبقات ابن سعد، ج ۵، ص ۲۱۲)

عدلیہ کی آزادی کا خاتمہ قضا (JUDICIARY) کی انتظامیہ سے آزادی کا اصول بھی اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں میں سے تھا۔ خلافت راشدہ میں قاضیوں کا تقرر اگرچہ خلفاء ہی کرتے تھے، مگر جب کوئی شخص قاضی مقرر ہو جاتا تھا تو اس پر خدا کے خوف اور اس کے اپنے علم و ضمیر کے سوا کسی کا کوئی دباؤ نہ رہتا تھا کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی عدالت کے کام میں دخل دینے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ حتیٰ کہ قاضی خود خلیفہ کے خلاف فیصلہ دے سکتے تھے اور دیتے تھے مگر جب ملوکیت آئی تو بالآخر یہ اصول بھی ٹوٹنا شروع ہو گیا۔ جن معاملات سے ان بادشاہ قسم کے خلفاء کو سیاسی اسباب، یا ذاتی مفاد کی بنا پر دلچسپی ہوتی تھی اُن میں انصاف کرنے کے لیے عدالتیں آزاد نہ رہیں حتیٰ کہ شاہزادوں، گورنروں، قائدین اور شاہی محلات کے متوسلین تک کے خلاف مقدمات میں عدل کرنا مشکل ہو گیا۔ یہ ایک بڑا سبب تھا اس بات کا کہ اُس زمانہ میں صالح علماء بالعموم قضاء کا منصب قبول کرنے سے انکار کر دیتے تھے، اور جو عالم اِن حکمرانوں کی طرف سے عدالت کی کرسی پر بیٹھنے پر راضی ہو جاتا تھا، اسے لوگ شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتے تھے۔ عدلیہ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انتظامیہ کی دست درازی یہاں تک بڑھی کہ گورنروں کو قاضیوں کے عزل و نصب کا اختیار دے دیا گیا۔[۴۷] حالانکہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ اختیارات خلیفہ کے سوا کسی کو حاصل نہ تھے

شوریٰ کی حکومت کا خاتمہ | اسلامی ریاست کے بنیادی قواعد میں سے ایک اہم قاعدہ یہ تھا کہ حکومت مشورے سے کی جائے اور مشورہ اُن لوگوں سے لیا جائے جن کے علم، تقویٰ، دیانت اور اصابت رائے پر اُمت کو اعتماد ہو۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں قوم کے بہترین لوگ ان کے مشیر تھے جو دین کا علم رکھنے والے اور اپنے علم و ضمیر کے مطابق پوری آزادی کے ساتھ بے لاگ رائے دینے والے ہوتے تھے۔ پوری قوم کو ان پر یہ اعتماد تھا کہ وہ حکومت کو کبھی غلط راستے پر نہ جانے دیں گے۔ یہی لوگ امت کے اہل الحل والعقد تسلیم کیے جاتے تھے۔ مگر جب ملوکیت کا دور آیا تو یہ قاعدہ بھی بدل گیا۔ شوریٰ کی جگہ شخصی استبداد نے لے لی۔ حق شناس اور حق گو اہل علم سے بادشاہ، اور بادشاہوں سے یہ لوگ دور بھاگنے لگے۔ اب بادشاہوں کے مشیر اگر تھے تو ان کے گورنر، قائدین، شاہی خاندان کے امراء، اور درباری لوگ تھے، نہ کہ وہ اہل الرائے اصحاب جن کی قابلیت اور دیانت و امانت پر امت کو اعتماد تھا۔

اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ایک بڑھتے ہوئے تمدن میں پیش آنے والے قانونی مسائل میں فیصلہ دینے والا کوئی ایسا با اختیار ادارہ باقی نہ رہا جس کی طرف معاملات میں بروقت رجوع کیا جا سکتا ہو، جس کے اجماعی یا جمہوری فیصلے قانون اسلامی کے جز بن جائیں، اور پھر ملک کی تمام عدالتیں انہی کے مطابق معاملات کے تصفیے کرنے لگیں۔ جہاں تک حکومت کے نظم و نسق، اہم داخلی و خارجی مسائل، اور عام پالیسی کے معاملات کا تعلق تھا، یہ شاہی کونسل ان کے فیصلے تو بُرے یا بھلے کر سکتی تھی لیکن قانونی مسائل کے فیصلے کرنا اُس کے بس کا کام نہ تھا۔ اِس کی جرأت اگر یہ لوگ کرتے بھی تو امت کا اجتماعی ضمیر اُن کے فیصلوں کو ہضم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ خود بھی اپنی حیثیت کو جانتے تھے، اور امت بھی ان کو فاسق و فاجر سمجھتی تھی۔

[۴۷] السیوطی، حسن المحاضرہ، ج ۲، ص ۸۸۔ المطبعۃ الشرفیہ، مصر، ۱۳۲۷ھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کا کوئی دینی و اخلاقی وقار نہ تھا کہ ان کے فیصلے اسلامی قانون میں شامل ہو سکتے۔ علماء اور فقہاء نے اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر ان کی یہ کوشش انفرادی نوعیت کی تھی۔ ہر عالم اپنی درس و افتاء کی مسند سے قانونی احکام بیان کرتا تھا، اور ہر قاضی اپنے علم و فہم اور اپنے اجتہاد کے مطابق، یا کسی دوسرے عالم کے فتوے کی بنا پر، جس چیز کو بھی قانون سمجھتا تھا اس کے مطابق فیصلے کر دیتا تھا۔ اس سے قانون کے تسلسل و ارتقاء میں تو انقطاع واقع نہ ہوا، لیکن اسلامی مملکت میں ایک قانونی انارکی پیدا ہو گئی۔ پوری ایک صدی تک اُمت کے پاس کوئی ایسا ضابطہ نہ تھا جسے سند کی حیثیت حاصل ہوتی اور مملکت کی تمام عدالتیں اُس کی پیروی کر کے جزئیاتِ مسائل میں یکساں فیصلے کر سکتیں۔

نسلی و قومی عصبیتوں کا اُبھار ایک اور عظیم تغیّر جو اس دورِ ملوکیت میں رُونما ہوا وہ یہ تھا کہ اس میں قوم، نسل، وطن اور قبیلہ کی وہ تمام جاہلی عصبیتیں پھر سے اُبھر آئیں جنہیں اسلام نے ختم کر کے خدا کا دین قبول کرنے والے تمام انسانوں کو یکساں حقوق کے ساتھ ایک اُمت بنایا تھا۔ بنی اُمیہ کی حکومت ابتدا ہی سے ایک عرب حکومت کا رنگ لیے ہوئے تھی جس میں عرب مسلمانوں کے ساتھ غیر عرب نومسلموں کے مساوی حقوق کا تصور قریب قریب مفقود تھا۔ اُس میں اسلامی احکام کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے نومسلموں پر جزیہ لگایا گیا، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس سے نہ صرف اشاعتِ اسلام میں شدید رکاوٹ پیدا ہوئی، بلکہ عجمیوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اسلامی فتوحات نے دراصل اُن کو عربوں کا غلام بنا دیا ہے اور اب وہ اسلام قبول کر کے بھی اُن کے برابر نہیں ہو سکتے۔ پھر یہ خرابی اور آگے بڑھی۔ حالت یہ تھی کہ امام نماز مقرر کرتے ہوئے بھی یہ دیکھا جانے لگا کہ آدمی عرب ہے یا غیر عرب۔ کوفے میں حجاج بن یوسف نے حکم دے رکھا تھا کہ عرب کے سوا کوئی شخص نماز میں امام نہ بنایا جائے[۱۵]۔ حضرت سعید بن جُبیر جب گرفتار ہو کر آئے تو حجاج نے ان پر احسان جتایا کہ میں نے تم کو امام نماز

---

[۱۵] العقد الفرید، ج ۲، ص ۲۳۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنایا، حالانکہ یہاں عرب کے سوا کوئی امامت نہ کرا سکتا تھا۔[16] عراق میں نبطیوں کے ہاتھوں پر مہریں لگائی گئیں۔ بصرے سے نومسلم عجمیوں کا وسیع پیمانے پر اخراج کیا گیا۔[17] حضرت سعید بن جُبیر جیسے بلند مرتبہ عالم کو، جن کے پایتے کے آدمی اُس وقت دنیائے اسلام میں دو چار سے زیادہ نہ تھے، جب کوفے کا قاضی مقرر کیا گیا تو شہر میں شور مچ گیا کہ عرب کے سوا کوئی شخص قضا کا اہل نہیں ہو سکتا۔ آخرکار حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے صاحبزادے ابو بُردہ کو قاضی بنایا گیا اور ان کو حکم دیا گیا کہ ابن جبیر سے مشورہ لیے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں۔[18] حد یہ ہے کہ جنازوں پر بھی کسی عجمی کو نماز پڑھانے کے لیے آگے نہ کیا جاتا، اِلّا یہ کہ کوئی عرب لڑکا تک جنازہ پڑھانے کے لیے موجود نہ ہو۔[19] کسی غیر عرب نومسلم لڑکی سے اگر کوئی شخص شادی کرنا چاہتا تو اسے لڑکی کے باپ یا اُس کے رشتہ داروں کو پیغام دینے کے بجائے اُس عرب سے رجوع کرنا پڑتا تھا جس کے وِلا (PATRONAGE) میں وہ عجمی خاندان ہو۔[20] لونڈی کے پیٹ سے پیدا ہونے والے کے لیے عربوں میں ہجین (ھجین) کی اصطلاح رائج ہو گئی تھی، اور یہ خیال عام ہونے لگا تھا کہ وراثت میں اس کا حصہ عرب بیوی کی اولاد کے برابر نہیں ہو سکتا،[21] حالانکہ شریعت کی رُو سے دونوں طرح کی اولاد کے حقوق برابر ہیں۔ ابو الفرج الاصفہانی کی روایت ہے کہ بنی سُلیم کے ایک شخص نے ایک عجمی نومسلم سے اپنی بیٹی بیاہ دی تو محمد بن بشیر الخارجی نے مدینہ جا کر گورنر سے اس کی شکایت کی، اور گورنر نے فوراً زوجین میں تفریق کرا دی، اس نومسلم کو کوڑے لگوائے، اور اس کا سر، ڈاڑھی اور ابروئیں منڈوا کر اسے ذلیل کیا۔[22]

---

[16] ابن خلکان، وفیات الاعیان، ج ۲، ص ۱۱۵۔ مکتبۃ النہضۃ المصریہ، قاہرہ، ۱۹۴۸

[17] العقد الفرید، ج ۳، ص ۴۱۶ - ۴۱۷

[18] ابن خلکان، ج ۲، ص ۱۱۵

[19] العقد الفرید، ج ۳، ص ۴۱۳   [20] حوالہ مذکور

[21] ابن قُتیبہ، عیون الاخبار، ج ۲، ص ۶۱ طبع اول، مطبعۃ دار الکتب، مصر، ۱۹۲۸۔

[22] الاغانی، ج ۱۴، ص ۱۵۰۔ المطبعۃ المصریہ، بولاق، مصر، ۱۲۸۵ھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی وہ طرزِ عمل تھا جس نے عجم میں شعوبیت (عجمی قوم پرستی) کو جنم دیا، اور اسی کی بدولت خراسان میں بنی امیہ کے خلاف عباسیوں کی دعوت کو فروغ نصیب ہوا۔ عجمیوں میں عربوں کے خلاف جو نفرت پیدا ہو چکی تھی، عباسی داعیوں نے اسے بنی اُمیّہ کے خلاف استعمال کیا، اور انہوں نے اس امید پر عباسیوں کا ساتھ دیا کہ ہمارے ذریعہ سے انقلاب ہو گا تو ہم عربوں کا زور توڑ سکیں گے۔

بنی امیہ کی یہ پالیسی صرف عرب و عجم کے معاملے ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ خود عربوں میں بھی اس نے سخت قبائلی تفریق برپا کر دی۔ عدنانی اور قحطانی، یمانی اور مُضَری، اَزد اور تمیم، کلب اور قَیس کے تمام پرانے جھگڑے اس دور میں پھر سے تازہ ہو گئے۔ حکومت خود قبیلوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتی تھی اور اس کے عرب گورنر اپنی اپنی ولایتوں میں پورے تعصب کے ساتھ اپنے قبیلے کو نوازتے اور دوسرے قبیلوں کے ساتھ بے انصافیاں کرتے تھے۔ خراسان میں اسی پالیسی کی وجہ سے یمنی اور مُضری قبائل کی کشمکش اس حد تک بڑھی کہ عباسی داعی ابو مسلم خراسانی نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑا کر اُموی سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا۔ حافظ ابنِ کثیر البدایہ والنہایہ میں ابنِ عَساکر کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں عباسی فوجیں دمشق پر چڑھی چلی آرہی تھیں اُس وقت بنی اُمیّہ کے دارالسّلطنت میں یمانی اور مُضَری کی عصبیت پوری شدت کے ساتھ بھڑکی ہوئی تھی، حتیٰ کہ ہر مسجد میں دو محرابیں الگ الگ تھیں، اور جامع مسجد میں دو منبروں پر دو امام خطبے دیتے اور دو جماعتوں کی الگ الگ امامت کراتے تھے۔ ان دونوں گروہوں میں سے کوئی کسی کے ساتھ نماز تک پڑھنے کے لیے تیار نہ تھا۔[۲۳]

(باقی)

۲۳۔ البدایہ، جلد ۱۰، ص ۴۵۔

© rasailojaraid.com